اسلام کا دستوری قانون اور سیاسی نظام

(برعظیم پاکستان وہند کے فتاویٰ کا تجزیاتی مطالعہ)

محمد ارشد*

ابتدائیہ:

برعظیم پاکستان وہند میں اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق بعض مسائل، بالخصوص خلیفہ کی اہلیت کے شرائط (قرشیت وغیرہ)، سے متعلق علماء کے ہاں بحث ومباحثہ کا آغاز تحریک خلافت کے دنوں میں (۱۹۱۸-۱۹۲۲ء) ہوا۔ تحریک خلافت کے مخالف علماء نے ترکانِ عثمانی کی خلافت کی شرعی حیثیت کو چیلنج کیا، کہ ان کی نظر میں عثمانی خلفاء منصبِ خلافت کی ایک اساسی شرط، شرط قرشیت کو پورا نہ کرتے تھے (۱)۔ جب کہ تحریک خلافت کے حامی ومؤید علماء نے عثمانی خلافت کو شرعی طور پر جائز تسلیم کیا اور شرطِ قرشیت کی ایک مختلف تعبیر پیش کی (۲)۔ تحریک خلافت کے مخالف علماء کی رائے کے برعکس علماء کی اکثریت کی رائے یہ ٹھیری کہ منصبِ خلافت کے لیے ''قریشیت ہو تو افضل ہے نہ ہو تو غیر قریشی قابل بھی ہو سکتا ہے'' (۳)۔ اسلام کے دستوری قانون پر بحث وگفتگو کو خطباتِ اقبال (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) سے بھی مہمیز ملی۔ علامہ محمد اقبال نے اپنے مشہور خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا اور دورِ جدید کی مجالس قانون ساز (پارلیمان) کے حق اجتہاد اور قانون سازی کی وکالت کی۔ مزید براں ملوکیت وآمریت کے برخلاف جمہوری ونمائندہ طرزِ حکومت کے تصور کو اسلام کے سیاسی قانون کا مقصود ومطلوب قرار دیا (۴)۔

طبقۂ علماء کے ہاں اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام پر بحث وگفتگو کا آغاز ۱۹۴۰ء کی دہائی کے آغاز سے ہوا۔ تحریک پاکستان کے آغاز میں ہی (۱۹۴۰ء کے لگ بھگ) اسلام کے دستوری قانون اور نظامِ حکومت کے ایک خاکے (blueprint) کی تدوین بعض قائدینِ تحریک پاکستان کی توجہ کا مرکز بنی تو انہوں نے اس کے لیے علماء کی طرف رجوع کیا۔ ممتاز مسلم لیگی رہنما نواب سر محمد اسماعیل (۱۸۸۶-۱۹۵۸ء) نے نواب سعید چھتاری (م۱۹۸۲ء) کی سرکردگی میں مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸-۱۹۵۳ء)، مولانا آزاد سبحانی (۱۸۸۲-۱۹۵۷ء)، مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲-۱۹۷۸ء)، مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۹۰۰-۱۹۷۰ء) اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ پر مشتمل ایک مجلس (مجلس نظام اسلامی) تشکیل دی گئی۔ مجلس کے کنوینر سید سلیمان ندوی نے اسلامی دستور کے مہمات مسائل پر غور وفکر کے ساتھ ساتھ متعدد دیگر اہل فکر وعلم: مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری (۱۸۸۴-۱۹۴۸ء)، ڈاکٹر سید ظفر الحسن (م۱۹۴۹ء) اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی

*ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، علامہ اقبال کیمپس، لاہور، پاکستان

(۱۸۹۲-۱۹۵۶ء) وغیرہ) کو اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کرنے کی غرض سے تجاویز پیش کرنے کا کہا (۵)۔ چنانچہ مجلس نظامِ اسلامی نے طویل غور وفکر اور اہل علم وفکر سے استصواب رائے کے بعد اسلام کے سیاسی نظام کا ایک دستور العمل مرتب کیا۔ اس دستور العمل کی تدوین کا کام مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلوی کو تفویض کیا گیا۔ تاہم ان کا مرتب کردہ اسلامی دستور اور سیاسی نظام العمل کا خاکہ ۱۹۵۶ء سے قبل اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر نہ آسکا (۶)۔

جون ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی مستقبل قریب میں قیام پذیر ہونے والی مسلم ریاست ''پاکستان'' کے دستور اور اس کے نظام حکومت پر بحث کا آغاز ہوا۔ نومسلم فاضل محمد اسد (۱۹۰۰-۱۹۹۲ء) نے اپنی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامے عرفات کے شمارہ بابت جولائی ۱۹۴۷ء، میں قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی دستور کے اصول ومبادی کی توضیح وتشریح کا آغاز کیا (۷) جبکہ مارچ ۱۹۴۸ء میں ''اصول دستور اسلامی'' کے عنوان سے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کر کے شائع کیا (۸)۔ محمد اسد کے علاوہ بانی جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے خطبات اور تحریروں میں اسلامی دستور کے بنیادی اصول کی توضیح وتنقیح کی اور علمی وفکری نیز سیاسی محاذ پر اسلامی دستور کی تدوین وتنفیذ کا مقدمہ بڑی قوت وطاقت سے پیش کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی فکر سے متأثر اہل قلم نے ماہنامہ ترجمان القرآن میں اپنی تحریروں میں تواتر کے ساتھ اسلام کے سیاسی نظام کے خدوخال کی وضاحت کی (۹/ا)۔

قیام پاکستان کے بعد تحریک پاکستان میں سرگرم عمل علماء، جو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے بطور دیکھنے کے آرزومند تھے، مملکت کے دستور اور سیاسی نظام کو اسلام کے اصول واحکام پر استوار کرنے کا مطالبہ لے کر اٹھے۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۶-۱۹۴۹ء) اور ان کے ہم خیال ارکانِ دستور ساز اسمبلی خصوصاً ڈاکٹر عمر حیات ملک (۱۸۹۴-۱۹۸۲ء) وغیرہ کی مساعی کا نتیجہ مجلس دستور ساز کی طرف سے قرارداد مقاصد کی منظوری (مارچ ۱۹۴۹ء) کی صورت میں نکلا (۹/ب)۔ بعد ازاں مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کی ایک مجلس نے اسلامی دستور سازی کے سلسلہ میں تجاویز مرتب کیں جو علماء کے بائیس نکات کے نام سے مشہور ہوئیں (۱۰)۔ خود مجلس دستور ساز کی طرف سے دستور سازی کے سلسلہ میں تجاویز/ اسلامی دستور کے خاکہ کی تدوین کے لیے تشکیل کردہ اسلامی تعلیمات بورڈ (جس کے ارکان میں سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا ظفر احمد انصاری، پروفیسر عبدالخالق اور مولانا جعفر حسین مجتہد وغیرہ شامل تھے) نے بھی اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق تجاویز مرتب کیں (۱۱)۔

جنرل محمد ایوب کے عہد حکومت میں منعقدہ صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کے بطور صدارتی امیدوار کے منظرِ عام پر آنے پر اسلامی مملکت میں سربراہِ ریاست وحکومت کی اہلیت کے شرائط اور عورت کی حکمرانی کے مسئلہ نے علماء کی توجہ اپنی طرف مبذول کی (۱۲)۔ مابعد ادوار میں خصوصاً ۱۹۷۳ء میں آئین کی تدوین اور بعد ازاں جنرل محمد ضیاء الحق کی

طرف سے ۱۹۸۳ء کے آئین کی تشکیل نو کی غرض سے انصاری کمیشن کے قیام (۱۹۸۲ء)، ہر دو مواقع پر علماء نے دستوری و سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا (۱۳)۔ علماء نے ان مواقع پر دستوری و سیاسی مسائل پر رسائل تصنیف کیے اور فتاویٰ بھی جاری کیے۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء اور پھر ۱۹۹۳ء میں بینظیر بھٹو کی طرف سے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالنے پر عورت کی حکمرانی کے مسئلہ پر علماء نے بڑے شد و مد سے مباحثہ میں حصہ لیا۔ چنانچہ عورت کی حکمرانی کی حرمت میں کثیر تعداد میں رسائل و مقالات اور فتاویٰ منظرِ عام پر آئے۔

سطور ذیل میں ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری سے لے کر پاکستان میں بینظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت کے اختتام (۱۹۹۶ء) تک اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام کے متعلق پاکستان و ہند کے علمائے اہلسنت کے تینوں مکاتبِ فکر (دیوبندی، اہلحدیث اور بریلوی) کے فتاویٰ کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

امہات دستوری مسائل:

مملکتِ پاکستان کے لیے اسلامی دستور کی تدوین کی جدوجہد کے دوران میں وہ دستوری و سیاسی مسائل جو علما سے قرآن وسنت اور تاریخی نظائر (خصوصا خلافت راشدہ) کی روشنی میں توضیحات و تشریحات کا تقاضا کر رہے تھے، بالعموم حسب ذیل تھے:

۱: اسلامی ریاست کی صحیح صحیح تعریف کیا ہے؟ اسلامی ریاست آج کے سیاق و سباق میں کس ریاست کو کہا جائے گا؟ کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟

۲: اسلامی ریاست کے اعضاء (حاکمہ، مقنّنہ اور عدلیہ) کی ضع و ہیئت اور نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ کیا عہدِ نبوی کی مثالی اسلامی مملکت اور خلافت راشدہ کے سیاسی اوضاع (forms) کا نمونہ ہمیشہ کے لیے متعین ہو چکا ہے کہ جس کی تقلید و پیروی ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ضروری و لازمی ہے؟ یا پھر اسلام نے اس باب میں محض بنیادی اصول مقرر کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ جن کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر دور کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اسلامی ریاست و حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے اور اسلامی دستور کی جزئیات متعین کی جا سکتی ہیں؟

۳: اسلامی ریاست اپنی ماہیت میں ایک جمہوری ریاست ہے یا پھر یک جماعتی آمریت؟

۴: اسلامی ریاست میں ہیئت مقتدرہ (حاکمہ، تنفیذیہ)، مقنّنہ اور عدلیہ کی تشکیل و قیام کا طریق کار کیا ہوگا؟ سربراہ مملکت / سربراہ حکومت کا انتخاب و تقرر کیسے ہوگا؟ اس کی اہلیت کے اوصاف و شرائط (Qualifications) کیا ہوں گے؟ اس کے اختیارات کا دائرہ کیا ہوگا؟ حاکمہ (تنفیذیہ) اپنے افعال و وظائف کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی (مجلس شوریٰ وغیرہ) کے سامنے جواب دہ ہے کہ نہیں؟ نیز اس کے مواخذہ و عزل کا طریق کار کیا ہوگا؟

۵: مقننہ (مجلس شوریٰ) کی تشکیل کیسے ہوگی، بذریعہ انتخاب یا بذریعہ نامزدگی (سربراہِ مملکت رحکومت کی طرف سے)؟ اس کی رکنیت کے لیے اہلیت کی صفات کیا ہوں گی؟ کیا عورتوں کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا جائے گا؟ مجلس شوریٰ کے حق قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس کے حدود کیا ہوں گے؟ حاکمہ (تنفیذیہ) اور مقننہ (مجلس شوریٰ) کے باہمی ارتباط وتعامل کی صورت کیا ہوگی؟ سب سے اہم یہ کہ عصرِ جدید میں اسلام کے اصول شورائیت کو کیسے مؤثر طور پر روبہ عمل لایا جاسکتا ہے؟ شوریٰ کے فیصلوں کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا شوریٰ کے فیصلے حاکمہ کے لیے واجب التعمیل ہوں گے؟ یا سربراہ مملکت وحکومت شوریٰ کے فیصلوں کو ویٹو کرسکتا ہے؟

۶: ریاست کے تیسرے ستون عدلیہ کی تشکیل کیسے کی جائے گی؟ قانون سازی یا اس کی تعبیر وتشریح کے باب میں اس کے اختیارات کی نوعیت کیا ہوگی؟

۷: اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار کیا ہوگا؟ کیا اسلامی مملکت میں مختلف نظریات کی علمبردار سیاسی جماعتوں کے قیام اور پھر انھیں اپنے منشور کی بنیاد پر انتخابی سیاست میں معرکہ آرائی کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

۸: حق رائے دہی کی نوعیت کیا ہوگی اور ووٹر کی اہلیت کے اوصاف وشرائط کیا ہوں گے؟ کیا خواتین کو بھی حق رائے دہی حاصل ہوگا؟

۹: اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق وفرائض کیا ہوں گے؟ غیر مسلم شہریوں کی حیثیت وکردار (position and role) کیا ہوگا۔ ان کے مذہبی، قانونی وسیاسی اور شہریتی حقوق کیا ہوں گے؟ کیا غیر مسلم شہریوں کو حاکمہ اور مقننہ میں نمائندگی حاصل ہوگی؟ غیر مسلموں کے لیے نمائندگی کا حق تسلیم کرنے کی صورت میں ان کے انتخاب کا طریق کار کیا ہوگا؟ طریق انتخاب کیا ہوگا مخلوط یا جداگانہ؟

فتاویٰ لٹریچر اور دستوری وسیاسی مسائل:

برعظیم پاکستان وہند کے مفتیان کرام نے دستور اسلامی سے متعلق مذکورہ مسائل کو غور وفکر کا موضوع بنایا اور ان کے متعلق فتاویٰ جاری کیے۔ اس سلسلے میں یہ بات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں اسلامی دستور کی تدوین کے لیے سرگرم عمل علماء اور ان کے متبعین کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں دیگر علماء کے مجموعہ ہائے فتاویٰ کے مقابلے میں سیاسی اور دستوری مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے (۱۴)۔ گو علمائے اہلحدیث کی زیادہ تر توجہ کلامی مسائل اور اصلاح رسوم و بدعات پر مرکوز رہی ہے تاہم ان کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق مسائل پر چند فتاویٰ بھی ملتے ہیں۔ بریلوی مکتبِ فکر کے علماء کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں علمائے اہلحدیث وعلمائے دیوبند کے کلامی آرا کے رد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ان کے مجموعۂ ہائے فتاویٰ دستوری وسیاسی مسائل سے بالعموم معرا نظر آتے ہیں۔ بریلوی

مکتب فکر کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام کے متعلق مسائل و موضوعات سے اس عمومی بے اعتنائی کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عامۃ الناس (جن کے ہاں پاپولر رسوماتی اسلام کا چلن ہے) سیاسی و دستوری معاملات کو مذہبی نہیں بلکہ ایک خالص دنیوی (سیکولر) امر خیال کرتے رہے۔ چنانچہ وہ ان معاملات میں رہنمائی کے لیے علماء اور مفتیان کرام کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ایسے سیاسی قائدین کا اتباع کرتے رہے ہیں جو نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں پر اپنی عملی سیاست کا قصر تعمیر کیے ہوئے تھے، یا پھر اشتراکی نظام کی ترویج (روٹی کپڑا اور مکان کی فراہمی) جیسے پر کشش نعرے کو رواج دے کر سادہ لوح عوام کی توجہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ عامۃ الناس کے برخلاف جدید تعلیم یافتہ طبقات بالعموم مذہب و سیاست کی علیحدگی کے نظریے کے قائل رہے ہیں۔ البتہ ایسے تعلیم یافتہ افراد جو بانیٔ جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر سے متاثر تھے اور ملک میں اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے آرزومند تھے، وہ مذہبی و سیاسی جملہ مسائل میں رہنمائی کے لیے روایتی علماء کی طرف رجوع کے بجائے سید ابوالاعلیٰ مودودی یا پھر جماعت سے تعلق رکھنے والے دیگر اہلِ علم و نظر سے رجوع کرتے تھے۔ الغرض اسباب و محرکات خواہ کچھ بھی رہے ہوں برعظیم پاکستان و ہند کے مجموعہ ہائے فتاویٰ کے جائزہ سے اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام کا کوئی مربوط و مکمل خاکہ سامنے نہیں آتا، البتہ ان سے چند متفرق مسائل پر علماء کا موقف ضرور سامنے آجاتا ہے۔

سطورِ ذیل میں برعظیم پاکستان و ہند کے اہلِ سنت کے تینوں مکاتب فکر (دیوبندی، بریلوی، اور اہلِ حدیث) کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق مسائل پر فتاویٰ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان جملہ دستوری و سیاسی مسائل کو جو ان فتاویٰ کا موضوع بنے ہیں، زیر بحث لاتے ہوئے ان کی بابت مختلف آرا کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ا۔ سیاست شریعت سے جدا نہیں:

اسلامی دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق مسائل کے ضمن میں سب سے اہم سوال مذہب و سیاست کے باہمی تعلق کے بارے میں ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دیوبندی مکتبِ فکر کے مفتی رشید احمد نے اپنے مجموعہ فتاویٰ احسن الفتاویٰ میں اس سوال (استفتاء) کہ: ''کیا سیاست دین میں داخل ہے یا اس سے الگ نئی چیز؟ کے جواب میں دین و سیاست کے باہمی تعلق کی وضاحت کی ہے۔ مفتی رشید احمد کی رائے میں دین و سیاست کی علیحدگی کا نعرہ اپنی ماہیت میں دین اسلام کی روح کے منافی ہے اور جدید مغربی لادینی تہذیب کی پیداوار ہے۔ ان کے الفاظ میں:

> ''مروجہ سیاست اور اس کے تمام طور طریقے چونکہ یورپ سے درآمد ہوئے ہیں لہٰذا مغرب گزیدہ لوگوں نے یہ سوچ کر کہ ایسی سیاست کا دین اسلام سے کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا، اور دونوں ایک قدم بھی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، یہ نعرہ لگایا:

''دین و سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں''

یورپ والوں کو تو یہ نعرہ زیب دیتا ہے کہ ان کے دین میں سیاست کی کوئی گنجائش نہیں، حکومت و سلطنت کے لیے کوئی ہدایات نہیں، مگر ایک مسلمان کی طرف سے اس قسم کا نعرہ درحقیقت اس الحاد و بے دینی کا اظہار ہے کہ ہمارے دین میں بھی سیاست و حکومت کے لیے کوئی رہنما اصول نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں پائی جاتی، اس لیے ہم سیاست کو دین سے الگ رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس کا کفر والحاد ہونا محتاج دلیل نہیں۔ خلاصہ یہ کہ سیاست دین سے جدا نہیں بلکہ دین کہ کا ایک اہم شعبہ ہے مروجہ نعرہ مغرب پرست آخرت بیزار قسم کے لوگوں کا پھیلایا ہوا ہے''(۱۵):

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

۲۔ اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کی تعریف:

اس سلسلے میں ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی تعریف کیا ہے؟ کسی مملکت و حکومت کے اسلامی ہونے کے کم از کم تقاضے کیا ہیں؟ اسلامی مملکت کی تعریف کے لیے کسی ملک میں شریعت کی تنفیذ ضروری ہے یا اس ملک کی آبادی کی اکثریت کا مسلمان ہونا کافی ہے؟ ایک ایسی مملکت جس میں قرآن وسنت کے عملی نظام کا نفاذ نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ مملکت اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟

مفتی رشید احمد نے اس ضمن میں اسلامی مملکت اور اسلامی حکومت کی بڑی مختصر مگر جامع تعریف بیان کی ہے۔ ان کی رائے میں:

> ''جس ملک میں اگرچہ عملاً اسلامی احکام اسلام کا نفاذ نہ ہو مگر تنفیذِ احکام پر قدرت ہو وہ دارالاسلام ہے، اس معنی سے اسے اسلامی ملک بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر ایسے ملک کی حکومت کو اس وقت تک حکومتِ اسلامیہ نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ وہ احکامِ اسلام کی تنفیذ نہ کرے''(۱۶)۔

۳۔ نظام حکومت۔ عوامی رجمہوری یا شاہی:

ایک اہم سوال نظام حکومت کا ہے۔ موجودہ جمہوری نظام جو مغربی سیکولر تہذیب کی تخلیق ہے اور اس وقت مشرق و مغرب کے بہت سے ممالک میں نافذ ہے جس میں بیک وقت کئی جماعتوں کا وجود شرط ہے، کیا اسلام میں اس کی گنجائش ہے؟ بالفاظ دیگر جدید مغربی جمہوری نظام اسلام کے سیاسی اصول و تصورات سے کس حد تک متصادم ہے اور ان دونوں میں کس طور سے موافقت اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے؟ اس ضمن میں کچھ اس طرح کے عمومی سوالات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں: اسلام میں طرزِ حکومت شاہی ہے یا جمہوری؟ اگر جمہوری ہے تو طریقِ انتخاب کیا ہے؟ اسلامی جمہوریت میں مسلمانوں کا سربراہ کیسے منتخب کیا جاتا ہے؟ کیا مرد اور عورت سب کو رائے دہی کا حق ہے یا صرف مردوں کو؟ اور کیا صرف اربابِ عقول

اور سمجھدار لوگوں سے رائے لی جائے یا سب سے، سمجھدار اور بے سمجھ چرواہوں اور بے وقوفوں سے بھی؟ غرضیکہ جن لوگوں کو اپنا خلیفہ/امیر اور ارکان شوریٰ (مجلس اہلِ حل وعقد/ پارلیمان) منتخب کرنے میں کوئی سمجھ بوجھ نہیں کہ کون اہلیت رکھتا ہے، کیا ان سے بھی رائے لی جائے یا نہیں؟

ان سوالات کا جواب دو معروف دیوبندی علماء (مفتی رشید احمد اور مولانا محمد یوسف لدھیانوی) نے دیا ہے۔ دونوں نے اپنے فتاویٰ میں مغربی جمہوریت کو شر کا منبع قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں اسلام میں مغربی جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مفتی رشید احمد کی رائے میں:

> ''اسلام میں مغربی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں، (۱) اس [مغربی جمہوریت] میں متعدد گروہوں کا وجود (حزب اقتدار و حزب اختلاف) ضروری ہے، جبکہ قرآن اس تصور کی نفی کرتا ہے (**واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا**، القرآن ۳:۱۰۳)؛ (۲) اس میں تمام فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہیں جب کہ قرآن اس اندازِ فکر کی بیخ کنی کرتا ہے (**وان تطع اكثر من في الارض يضلوك عن سبيل الله**، القرآن ۶:۱۱۶)؛ (۳) یہ غیر فطری نظام یورپ سے درآمد ہوا ہے جس میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ اس میں مرد وعورت، پیر وجواں، عامی وعالم بلکہ دانا و ناداں سب ایک ہی بھاؤ تلتے ہیں۔ جس امیدوار کے پلے ووٹ زیادہ پڑ جائیں وہ کامیاب قرار پاتا ہے اور دوسرا ناکام، مثلاً کسی آبادی کے پچاس علماء، عقلاء اور دانشوروں نے بالاتفاق ایک شخص کو ووٹ دیے، مگر ان کے بالمقابل علاقہ کے بھنگیوں، چرسیوں اور بے دین واوباش لوگوں نے اس کے مخالف امیدوار کو ووٹ دیے جن کی تعداد اکاون ہوگئی تھی تو یہ امیدوار کامیاب اور پورے علاقے کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔ پھر ووٹ لینے کے لیے ہر جائز وناجائز حربہ کا استعمال لازمۂ جمہوریت ہے۔ ہر فریق اپنے مقابل کو چت کرنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ مزید براں دھونس، دھاندلی، دھوکا، فریب، رشوت، غرض تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں، اور جو کامیاب ہوتے ہیں ان کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ایوان اسمبلی میں پہنچ کر ان کی بولی لگتی ہے، فیکٹریوں کے پرمٹ، پلاٹس، وزارتیں، غرض یہ کہ طرح طرح کے لالچ اور چکمے دے کر انہیں خریدا جاتا ہے۔ پھر قوم کے یہ منتخب نمائندے اسمبلی ہال میں بیٹھ کر کیا گل کھلاتے ہیں؟ یہ تمام برگ وبار مغربی جمہوریت کے شجرۂ خبیثہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام میں اس کافرانہ نظام کی کوئی گنجائش نہیں، نہ ہی اس طریقے سے قیامت تک اسلامی نظام آسکتا ہے۔ بمصداق ''**الجنس يميل الى الجنس**'' عوام، جن کی اکثریت بے دین لوگوں کی ہے، اپنی ہی جنس کے نمائندے منتخب کرکے اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں'' (۱۷)۔

مفتی رشید احمد کی رائے میں مغربی جمہوریت اور اسلام کے سیاسی نظام میں جو بنیادی اور جوہری فرق و امتیاز پایا جاتا ہے وہ سربراہ مملکت رحکومت کے انتخاب کے طریق کار کا ہے۔ان کی رائے میں اسلام سربراہ مملکت رحکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں ہر کس و ناکس کو رائے دہی (ووٹ) کا حق نہیں دیتا بلکہ یہ حق اہل الحل والعقد کو تفویض کرتا ہے۔ مفتی رشید احمد اس سلسلے میں خلفائے راشدین کے انتخاب کے طریق سے استشہاد کرتے ہیں۔ان کے خیال میں:

''اسلام میں شورائی نظام ہے جس میں اہل الحل والعقد غور و فکر کر کے ایک امیر کا انتخاب کرتے ہیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات کے وقت چھ اہل الحل والعقد کی شوریٰ بنائی جنہوں نے اتفاق رائے سے حضرت عثمان کو خلیفہ نامزد کیا۔ اس پاکیزہ نظام میں انسانی سروں کو گننے کے بجائے انسانیت کا عنصر تولا جاتا ہے، اس میں کسی ایک ذی صلاح مدبر انسان کی رائے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی رائے پر بھاری ہو سکتی ہے:

گریز از طرز جمہوری غلامِ پختہ کارے شو

کہ در مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

حضرت ابو بکر نے کسی سے استشارہ کیے بغیر صرف اپنی ہی صوابدید سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب فرمایا۔آپ کا یہ انتخاب کس قدر موزوں، مناسب اور نپا تلا تھا؟اس کا جواب دینا الفاظ میں ممکن نہیں،اس حقیقت کا مشاہدہ پوری دنیا کھلی آنکھوں سے کر چکی ہے'' (۱۸)۔

خلفائے راشدین کے انتخاب کے طریق سے متعلق تاریخی نظائر کو مفتی رشید احمد اسلامی دستورِ مملکت کا ایک ابدی اصول تسلیم کرتے ہیں اور یہی چیز ان کی نظر میں اسلام کے سیاسی نظام کو مغربی جمہوریت سے ممتاز کرتی ہے۔ان کی رائے میں اسلامی مملکت کے سربراہ کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہیں بلکہ متعینہ صفات کے حامل اہل حل وعقد کی رائے سے عمل میں آئے گا۔مفتی رشید احمد کے الفاظ میں:

''جمہوریت مروجہ میں ہر کس و ناکس کو رائے دہی کا حق ہے مگر جمہوریت اسلامیہ میں انتخاب خلیفہ کا حق صرف اہل حل و عقد کو ہے۔اہلِ حل و عقد کے لیے پانچ شرائط ہیں: (ا) عقائد اسلام میں رسوخ و مضبوطی؛ (ب) ذکورہ؛ (۳) علم دین میں رسوخ؛ (۴) تقویٰ وتصلب فی الدین؛ (۵) ملکی حالات و سیاسیاتِ حاضرہ میں بصیرتِ تامہ''(۱۹)۔

مفتی رشید احمد کی رائے میں نصوص شرعیہ کے علاوہ عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ انتخاب امیر ہر کس و ناکس کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور علم دین وتقویٰ کے بغیر عقل کامل نہیں ہو سکتی (۲۰)۔ان کی رائے میں مغربی جمہوری نظام اور اسلام کے سیاسی نظام میں دوسرا جوہری فرق سربراہ مملکت رحکومت اور مجلس شوریٰ کے اختیارات میں توازن کا

ہے۔ان کی رائے میں:

''جمہوریت مروجہ میں سربراہ مملکت خودمختار نہیں ہوتا بلکہ مقننہ کے فیصلہ کا پابند ہوتا ہے اور جمہوریت اسلامیہ میں امیر المؤمنین خودمختار ہوتا ہے، اہم امور میں اہل حل وعقد سے مشورہ کے تابع جو اس کی رائے میں صواب ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، شوریٰ کے فیصلہ کا پابند نہیں، قال اللہ تعالیٰ: **و شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (۳:۱۵۹)(۲۱)۔**

اسلام میں جمہوریت کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اسکے بارے میں مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے بھی اپنے فتاویٰ میں بتفصیل اظہار خیال کیا ہے۔ان کی رائے میں بھی اسلام اور جمہوریت کے مابین فرق نہایت وسیع وعمیق ہے، بلکہ یہ اپنی روح کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ان کے الفاظ میں:

''جمہوریت اس دور کا صنم اکبر ہے جس کی پرستش اول اول دانایان مغرب نے شروع کی، کیونکہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم تھے اس لیے ان کی عقل نارسا نے دیگر نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں جمہوریت کا بت تراش لیا اور پھر اس کو مثالی طرزِ حکومت قرار دے کر اس کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ پوری دنیا میں اس کا غلغلہ بلند ہوا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی تقلید مغرب میں جمہوریت کی مالا جپنی شروع کر دی۔کبھی یہ نعرہ لگایا کہ ''اسلام جمہوریت کا علمبردار ہے'' اور کبھی ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح وضع کی گئی، حالانکہ مغرب جمہوریت کے جس بت کا پجاری ہے اس کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی ضد ہے۔اس لیے اسلام کے ساتھ جمہوریت کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحاً غلط ہے'' (۲۲)۔

۴۔طرز حکومت - صدارتی یا پارلیمانی:

مغربی جمہوریت کے علمبردار ممالک میں یا تو صدارتی نظام رائج ہے یا پھر پارلیمانی۔ان میں سے کون سا طرزِ حکومت اسلام کے سیاسی اصول سے زیادہ موافق وہم آہنگ ہے؟ مفتی محمد شفیع (۱۸۹۷۔۱۹۷۶ء) نے اس مسئلہ کو یوں حل فرمایا ہے:

''حکومت کے مروجہ طریقوں میں سے صدارتی طرزِ حکومت اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر ہے۔قرآنی آیت: ﴿**یا داود انا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق**﴾ (۳۸:۲۶) کے مطابق حکم وفیصلہ کی ذمہ داری خلیفۂ وقت (امیر المومنین) پر ڈالی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیمانی طرز میں امیر مملکت پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، یہ صرف صدارتی طرز میں ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآنی آیت (۴:۵۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اولوالامر کا مسلم ہونا شرط ہے اور موجودہ دنیا میں اس شرط پر عمل صدارتی طرزِ حکومت میں بآسانی ہوسکتا ہے جس میں ولایت امر اور

اقتدار اصلی صدر مملکت کا ہوتا ہے اس لیے مسلمان ہونے کی شرط عملاً سہل ہے بخلاف پارلیمانی نظام کے کہ اس میں صدر مملکت محض ایک نمائشی چیز ہے، اصل اقتدار صرف پارلیمان کا ہوتا ہے اور پوری پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا عملاً دشوار ہے اس لیے بھی صدارتی طرزِ حکومت اصولِ اسلام سے قریب تر ہے" (۲۳/ا)۔

۵۔شرائط اہلیتِ امیر/سربراہ مملکت وحکومت:

سربراہ مملکت/حکومت کی اہلیت کے شرائط واوصاف ایک اہم دستوری مسئلہ ہے۔ مفتی رشید احمد کی رائے میں نصوص قرآن وسنت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ امیر ایسے شخص کو منتخب کرنا فرض ہے جس میں امارت کی اہلیت ہو (۲۳/ب)۔ ان کی رائے میں اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذات میں نہ صرف ان تمام شرائط واوصاف کا پایا جانا ضروری ہے جو اہل حل وعقد کے لیے لازم ہیں، بلکہ اس کے لیے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب ہمت وشجاعت ہو۔ مفتی رشید احمد کی رائے ملاحظہ ہو:

"اہلیتِ اہلِ حل وعقد کے لیے پانچ شرائط ہیں: (ا) عقائد اسلام میں رسوخ ومضبوطی؛ (ب) ذکورہ؛ (۳) علم دین میں رسوخ؛ (۴) تقویٰ وتصلب فی الدین،؛ (۵) ملکی حالات وسیاسیاتِ حاضرہ میں بصیرتِ تامہ (۲۴)۔ امیر کے لیے اہلیت حل وعقد کی شرائطِ مذکورہ کے علاوہ شرط یہ بھی ہے کہ صاحب ہمت وشجاعت ہو" (۲۵)

۶۔عورت کی سربراہی:

وہ واحد دستوری مسئلہ جس کی بابت اہل سنت کے تینوں مکاتبِ فکر (دیوبندی، اہلحدیث اور بریلوی) کے مفتیان کرام کے فتاویٰ کثرت سے دستیاب ہیں وہ مسئلہ عورت کی حکمرانی کا ہے۔ اس امر پر تینوں مکاتب فکر کے ہاں ایک طرح کا اجماع پایا جاتا ہے کہ عورت کی حکمرانی جائز نہیں اور اسلامی مملکت/حکومت کے سربراہ کا مرداز روئے شریعت مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔ اسلامی مملکت میں سربراہی کے منصب کی ذمہ داریاں کسی خاتون کو سونپی نہیں جاسکتیں۔ لہٰذا کسی اسلامی حکومت میں عورت کو سربراہ بنانا ہرگز جائز نہیں اور اگر کہیں ایسا ہو جائے تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد سربراہی کی تبدیلی کے لیے ممکنہ کوششوں کو بروئے کار لائیں (۲۶)۔

عورت کی حکمرانی کے عدم جواز میں مفتی محمد اشرف القادری نے بھی تفصیلی دلائل بیان کیے ہیں۔ ان کی رائے میں اسلام میں عورت سربراہ مملکت بوجوہ ذیل نہیں ہوسکتی:

ا: اسلام میں سربراہ مملکت کے تقرر سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ اسلام میں سربراہ مملکت کی دو اہم ترین ذمہ داریاں ہوتی ہیں: اول اعلائے دین وتنفیذ واشاعت شریعت؛ دوم سیاست مدن یعنی انتظام ودفاع مملکت وفلاح و

نجاح رعیت۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کٹھن ذمہ داریاں، اعلیٰ ذہنی وجسمانی صلاحیتوں مثلاً جسمانی قوت وعلمی وسعت، کمالِ عقل و بصیرت، حسنِ تدبیر و جودتِ عزم وحزم، معاملہ فہمی و اصابتِ رائے جذبات پر قابو اور خود اعتمادی، مصائب میں صبر و استقامت، شدائد میں جوانمردی و ثابت قدمی و استقلال اور کمال شجاعت کے بغیر قطعاً پوری نہیں کی جاسکتیں۔ اور یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان خداداد خوبیوں اور خلقی وقدرتی صلاحیتوں میں بلاشبہ مرد فطری طور پر عورت سے بڑھ کر اور اس کے مقابلے میں عورت ان صفات سے کمتر موصوف ہے۔ لہٰذا حکومت وسربراہی مملکت کا بارگراں عورت کے کمزور کاندھوں پہ ڈال دینا خلاف فطرت و ناانصافی ہے۔ ہاں اسلام کی نگاہ میں ان عظیم اور کٹھن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا صرف اور صرف مرد ہی کا منصب ہے اور یہی فطرت وانصاف کا تقاضا ہے (۲۷)۔

اہل حدیث عالم مفتی محمد عبید اللہ خان عفیف کی رائے میں: ''عورت امامت کی اہل ہے (عورتوں کی جماعت کے لیے) مگر حکمرانی ناجائز ہے'' (۲۸)۔

ان فتاویٰ میں قطعی اور واضح طور پر اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ عورت امامت کبریٰ یعنی امارت عامہ کی اہل نہیں۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ منصب قضا پر بھی فائزہ ہوسکتی ہے کہ نہیں؟ اس سلسلے میں مفتی محمود (۱۹۱۹-۱۹۸۰ء) کی رائے یہ ہے کہ ''ضروری طور پر بعض مسائل میں حدود وقصاص کے علاوہ اگر اس کو حکم (ثالث) بنایا جائے تو گنجائش ہے، اور اس میں بھی کامیابی مشکل ہے، لیکن کسی ملک کی تمام ذمہ داریوں کو اس کے حوالے کر دینا خلافِ عقل ونقل ہے'' (۲۹)۔

۷۔ طریق انتخابِ امیر/سربراہ مملکت وحکومت:

جیسا کہ سطورِ بالا میں مغربی جمہوریت اور اسلام کے سیاسی نظام کے مابین جوہری فرق کے بیان میں مفتی رشید احمد کی رائے نقل کی جاچکی ہے کہ اسلام کے نظام سیاست میں سربراہ مملکت/حکومت کے انتخاب وتقرر کے ضمن میں مملکت کے تمام شہریوں کو حق رائے دہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ حق صرف اور صرف اہل حل وعقد کو حاصل ہے۔ مفتی رشید احمد کی اس رائے کی تائید حافظ عبداللہ روپڑی کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔ حافظ عبداللہ روپڑی کی رائے میں بھی رائے عامہ کو اسلام کے سیاسی نظام میں کوئی اہمیت حاصل نہیں، بلکہ اصل اہمیت اہل حل وعقد کی رائے کو ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت/حکومت کے سربراہ کا انتخاب وتقرر رائے عامہ سے نہیں بلکہ اہل حل وعقد کی رائے کے ذریعے ہوگا:

> ''انتخاب مجلس شوریٰ کے ارکان حل وعقد کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی کو جب باغیوں نے امیر بنانا چاہا تو فرمایا یہ تمہارا کام نہیں بلکہ مہاجرین وانصار کا کام ہے، جس کو وہ امیر بنائیں گے وہ امیر ہوگا۔ مجموعی ووٹنگ اور رائے عامہ کوئی چیز نہیں۔ موقعہ محل کے لحاظ سے جس طرح انتخاب ہو جائے کر لینا چاہیے۔ جیسے ابوبکر صدیق کا انتخاب ہوا'' (۳۰)۔

مفتی رشید احمد کی رائے میں ''عوام پر یہ فرض ہے کہ انتخاب امیر کا مسئلہ خود طے کرنے کی بجائے ایسے اہل حل وعقد کے سپرد کریں جن میں انتخاب کی اہلیت ہو۔نصوص شرعیہ کے علاوہ عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ انتخاب امیر ہر کس ونا کس کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور علم دین وتقویٰ کے بغیر عقل کامل نہیں ہو سکتی'' (۳۱)۔

سربراہ مملکت رحکومت کے انتخاب کے طریق کے بارے میں مفتیان کرام نے بالعموم قرون وسطیٰ کے سیاسی مفکرین کی آراء کو من وعن قبول کرلیا ہے۔ اور اس کا مطلق خیال نہیں رکھا کہ دور جدید کے ایک غیر قبائلی معاشرے میں جدید ریاستی نظاموں کے تجربات سے اخذ واستفادہ کرتے ہوئے انتخاب سربراہِ مملکت کے کون کون سے جائز طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔مفتی رشید احمد کی رائے میں اسلام میں انتخاب امیر کے تین طریقے ہیں:

۱: بیعت اہل وعقد، کما وقع لسیدنا ابی بکر۔

۲: استخلاف، خلیفۂ وقت چند اہل حل وعقد سے مشورہ کر کے کسی کے بارے میں وصیت کردے کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوگا، جیسا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان، عبدالرحمن بن عوف، سعید بن زید، اسید بن حضیر اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کو منتخب فرمایا (۳۲)۔

استخلاف ابوبکر کی تفصیل مذکور سے ثابت ہوا کہ بذریعۂ استخلاف انعقاد خلافت کے لیے تین شرائط ہیں:
(ا) خلیفۂ اول میں خلافت کی سب شرائط موجود ہوں؛ (ب) خلیفہ ثانی بھی سب شروط خلافت کا متجمع ہو؛
(ج) خلیفہ اول نے خلیفہ ثانی کے انتخاب میں اہل حل وعقد سے مشورہ کیا ہو۔

۳: شوریٰ، خلیفۂ وقت چند اہل حل وعقد کی شوریٰ متعین کر کے یہ وصیت کردے کہ میرے بعد یہ لوگ اتفاق رائے سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کریں، جیسا کہ حضرت عمر نے چھ رکنی مجلس متعین فرمائی، اس کے ذریعے حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آیا (۳۳)۔

مفتی رشید احمد کی رائے میں اگرچہ خلافت راشدہ کے سیاسی نظائر سے انتخاب امیر کے یہی تین طریقے ثابت ہیں، البتہ انعقادِ خلافت کا ایک چوتھا طریقہ استیلاء وتغلب کا بھی ہے، یعنی خلیفہ وقت کی موت کے بعد کوئی شخص جبراً و قہراً مسلط ہو جائے۔مفتی رشید احمد کے نزدیک ایسے شخص کی خلافت منعقد ہو جائے گی، اس لیے اس کی اطاعت واجب ہے۔مفتی رشید کے نزدیک استیلاء وتغلب کے ذریعے انعقادِ خلافت کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) یہ شخص شروط خلافت کا متجمع ہو اور لوگوں کو صلح وحسن تدبیر سے مائل کرے، کوئی ناجائز اقدام نہ کرے۔یہ قسم جائز ہے، حضرت معاویہ کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی تھی۔

۲) اس شخص میں شروط خلافت نہ ہوں، اور اپنے مخالفین کو قتال اور دوسرے ناجائز حربوں سے تابع کرلے، یہ جائز نہیں، ایسا

شخص فاسق اور سخت گنہگار رہے، مگر اس کے باوجود اس کے تسلط کے بعد اس کی اطاعت واجب ہے، بشرطیکہ اس کا حکم خلافِ شرع نہ ہو، اس کی مخالفت اور اسے معزول کرنے کی کوشش جائز نہیں (۳۴)۔

مفتی رشید احمد کے اس فتوے کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انعقادِ خلافت (خلیفہ کے انتخاب وتقرر) میں متقدمین مسلم سیاسی مفکرین میں سے الماوردی اور متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ دہلوی کے نقطۂ نظر کو پورے طور سے اختیار کر لیا ہے (۳۵)۔

اہلحدیث علماء نے بالعموم انتخاب امیر مملکت کے طریق سے متعلق اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کی رائے میں ''قرون خیر میں انتخابات کی مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں لیکن آئینی طور پر انتخاب کو نہ ان چار صورتوں میں حصر کیا گیا ہے اور نہ کسی ایک ہی کو پسند کیا گیا ہے بلکہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی ایسا آدمی اس بوجھ کو اٹھائے جو مساکین کو اونچا کر سکے اور خود مساکین کی سی زندگی بسر کرے'' (۳۶) ۔ایک دوسرے اہل حدیث عالم ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد کی رائے میں بھی سربراہ مملکت کے انتخاب کے لیے اسلام نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے۔ جدید مغربی دنیا میں انتخابات کے جو طریقے رائج ہیں اسلام کے سیاسی نظام میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ وہ سربراہ مملکت کے منصب کے لیے اہل فرد کے انتخاب وتقرر کے لیے جدید طریق انتخابات (الیکشن) کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں ''واضح رہے کہ موجودہ الیکشن جمہوریت کی پیداوار ہیں، اسلام میں اس کی گنجائش موجود ہے کیوں کہ اس میں سربراہ مملکت کے انتخاب کے لیے کوئی لگا بندہ قاعدہ مقرر نہیں ہے بلکہ حالات وظروف کے پیش نظر اسلام میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے'' (۳۷)۔ تاہم ایک تیسرے سلفی عالم حافظ عبدالمنان نور پوری موجودہ جمہوریت وطریق انتخابات کو بدعت تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں یہ سب قرآن وسنت سے ثابت نہیں۔ ان کی رائے میں ''رائج جمہوریت والیکشن کتاب وسنت سے ثابت نہیں ۔۔۔ مروجہ الیکشن کتاب وسنت سے ثابت نہیں'' (۳۸)۔

۸۔ سربراہِ مملکت رحکومت کی مدت انتخاب:

زیر بحث مجموعہ ہائے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مفتیان کرام سربراہِ مملکت رحکومت کے انتخاب وتقرر کے لیے کسی معینہ مدت کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مدت انتخاب سے زیادہ اہمیت اس منصب کے لیے منتخب ہونے والے فرد میں پائے جانے والے اوصاف کو حاصل ہے۔ اگر منصب سربراہی پر فائز ہونے والا شخص مطلوبہ شرائط پر کماحقہ پورا اترتا ہو تو اس کے عہدے کی میعاد مقرر کرنا نامناسب ہوگا۔ چنانچہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی رائے میں:

''انتخاب ہر پانچ سال بعد کرانا کوئی شرعی فرض نہیں، لیکن حکمران میں کوئی بھی ایسی خرابی نہ پائی جائے جو اس

کی معزولی کا تقاضا کرتی ہو تو اس کو بدلنا بھی جائز نہیں۔ دراصل اسلام کا نظریہ اس بارے میں یہ ہے کہ وہ حکومت تبدیل کرنے کے مسئلہ کو اہمیت دینے کے بجائے منتخب ہونے والے حکمران کی صفاتِ اہلیت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسلامی ذوق سے قریب تر بات یہ ہے کہ قوم کے اہل رائے حضرات صدر یا امیر کا چناؤ کریں اور پھر وہ اہل الرائے کے مشورے سے اپنے معاونین ورفقاء کو خود منتخب کرے'' (۳۹)۔

۹۔ مجلس شوریٰ رمجلس اہل حل وعقد کی تشکیل:

مجلس شوریٰ رمجلس اہل حل وعقد نیز اس کے ارکان کی اہلیت کے شرائط واوصاف نیز مجلس شوریٰ رمجلس اہل حل وعقد کی تشکیل وتقرر کے بارے میں فتاویٰ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتیان کرام ارکان شوریٰ (اہل حل وعقد) کے لیے چند معینہ شرائط واوصاف کو تو ناگزیر خیال کرتے ہیں البتہ شوریٰ کو ایک ادارے کی شکل میں منظم کرنے نیز ارکان شوریٰ کے انتخاب کے لیے کسی نوع کے استصواب رائے کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ ارکان شوریٰ کے انتخاب کو رئیسِ مملکت ر حکومت کا صوابدیدی اختیار تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجلس شوریٰ کے ارکان کی تعداد کی تعیین کو بھی غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی رائے میں ارکان شوریٰ کی اہلیت کے شرائط واوصاف کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، البتہ بقیہ امور چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں مفتی رشید احمد اور مفتی محمد شفیع کے فتاویٰ کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے (۴۰)۔ مفتی محمد شفیع ارکانِ شوریٰ کے انتخاب کو امیر مملکت کی ذاتی رائے پر منحصر خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ''ارکان مجلس شوریٰ کا انتخاب بھی اسلامی سیاست میں اس طوفان بے تمیزی کے ساتھ نہیں ہوتا جو موجودہ جمہوریت کا طغرائے امتیاز ہے اور جس کی بدولت تمام ملک جنگ وجدل بغض وعناد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے بلکہ یہ انتخاب عموماً امیر خود اپنی رائے سے کرتا ہے'' (۴۱)۔

۱۰۔ اصول مشورہ۔ مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے پر ہے یا امیر مجلس کی رائے پر:

امور مملکت وحکومت کے باب میں مجلس شوریٰ رمجلس اہل حل وعقد کے مشورہ کے ردوقبول میں سربراہ مملکت رحکومت کے اختیارات کیا ہیں اور ان اختیارات کے استعمال کی حدود کیا ہیں؟ جدید مغربی نظام سیاست میں امور مملکت میں فیصلہ سازی کا معاملہ ہو یا مہمات امور میں قانون سازی کا عمل ہو، ان سب امور میں مقننہ کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ان اداروں میں بحث مباحثہ کے بعد اصول اکثریت (اکثریت کی رائے) کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔ جبکہ مذکورہ مجموعہ ہائے فتاویٰ کے مؤلفین کی آرا سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ ''مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرت رائے کے سپرد نہیں، بلکہ امیر کی رائے پر ہے اور اس کو اختیار ہے کہ اقلیت کو اکثریت پر ترجیح دے دے'' (۴۲)۔ گویا سربراہ مملکت رحکومت ہر معاملے میں مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت کی رائے کو ویٹو کر کے تنہا اپنی رائے کے موافق فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس ضمن میں مفتی محمد شفیع قرآن حکیم کی آیت: ﴿و شاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله﴾ سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کی رائے میں قرآن عزیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم فرمانے کے بعد: ﴿فاذا عزمت فتوکل علی اللہ﴾ (پھر جب آپ عزم کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کریں)، بصیغہ واحد حاضر فرما کر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد کسی جانب کو ترجیح دے کر اس کا عزم کرنا فقط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ہوگا۔ خود آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے بہت سے معاملات اس کے شاہد ہیں" (۴۳)۔ اس مسئلے میں مفتی محمد شفیع کی تفصیلی رائے ملاحظہ ہو:

"اصولی طور پر اس بحث میں بھی ہمیں سب سے پہلے قرآن عزیز کو حکم بنانا چاہیے اور اسی کے فیصلہ کو محکم اور مختتم فیصلہ سمجھنا چاہیے۔ مشورہ کے متعلق قرآن عزیز کی سب سے زیادہ مشہور آیت یہ ہے: ﴿وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ﴾ (آپ (معاملات میں) صحابہ اور مسلمانوں سے مشورہ لیجیے اور جب پختہ ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کیجیے)۔ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم فرمایا یا ہے کہ اہم معاملات میں (جن میں صریح وحی نہ آئی ہو) صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد جب آپ کسی ایک جانب کا عزم فرمائیں تو اس میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں، اپنی رائے یا مشورہ پر بھروسہ نہ کریں۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ مشورہ کے بعد کسی ایک جانب کو ترجیح دینا اور اس کا عزم کرنا یہ فقط امیر مجلس کی رائے پر موقوف ہے۔ اور اگر مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے کے سپرد ہوتا تو مناسب تھا کہ عزم کے لیے بھی جمع کا صیغہ استعمال کر کے یوں فرمایا جاتا: "فاذا عزموا" (یعنی جب صحابہ کسی کام کا عزم کریں)" (۴۴)۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا موقف بھی اسی رائے کے مماثل ہے۔ ان کی رائے میں بھی "حکومت کا سربراہ اہل مشورہ سے مشورہ لینے کا پابند ہے مگر کثرت رائے پر عمل کرنے کا پابند نہیں، بلکہ قوتِ دلیل پر عمل کرنے کا پابند ہے" (۴۵)۔ حافظ عبداللہ روپڑی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھی مجلس شوریٰ کی حیثیت صرف یہی ہے کہ مشورہ طلب امور میں رائے پیش کر دے اور بس۔ اس کی رائے حاکمہ (سربراہ مملکت رحکومت) کے لیے واجب التعمیل ہرگز نہیں۔ حافظ عبداللہ روپڑی کی رائے ملاحظہ ہو:

"مجلس شوریٰ کی حیثیت صرف مشورہ کی ہوتی ہے مختلف آرائیں ہو جائیں تو فیصلہ امیر کرتا ہے خواہ قلت کی طرف کرے یا کثرت کی طرف اور مجلس شوریٰ کے ممبر اہلِ حل وعقد ہوتے ہیں جس معاملہ میں مشورہ کرنا ہو اس معاملہ میں جو مہارت رکھتے ہوں ان سے امیر مشورہ لے تعداد کوئی مقرر نہیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے ملک شام کو جانے کے موقع پر پہلے مہاجرین سے مشورہ لیا پھر انصار سے مشورہ کیا پھر پرانے مہاجرین سے مشورہ لیا۔ معاملہ یہ تھا کہ راستے میں خبر پہنچی کہ شام میں طاعون ہے اس حالت میں جانا چاہیے یا واپس ہو جانا چاہیے۔ حضرت عمر نے اس پر فیصلہ دے دیا" (۴۶)۔

اسلامی مملکت میں مجلسِ شوریٰ کے کردار اور اس کے اختیارات سے متعلق اس معروف نقطۂ نظر کے برخلاف مولانا محمد اسماعیل سلفی کے نزدیک مشورہ کے رد و قبول میں امیرِ مملکت کا اختیار کوئی امرِ منصوص ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا دستوری مسئلہ ہے جسے ہر دور میں اربابِ فکر کی صواب دید کے مطابق طے ہونا چاہیے۔۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کی رائے میں:

> ''مشورہ کے رد و قبول میں امام کے اختیارات کیا ہیں اور ان اختیارات کے استعمال کی حدود کیا ہیں یہ ایک دستوری مسئلہ ہے جسے ہر دور میں اربابِ فکر کی صوابدید کے مطابق طے ہونا چاہیے۔ نصوص میں نہ اس کی تصریح ہے اور نہ ہی ایسی چیزیں نصوص میں آنا ضروری ہیں۔ البتہ ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں جہاں امیر نے شوریٰ کو مسترد کر دیا۔ یہ دستوری مسائل ہر دور اور ہر ملک کے دانش مندوں کی رائے سے طے ہونے چاہئیں'' (۴۷)۔

۱۱۔ امیر کا مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہونا:

مجلس شوریٰ کے کردار اور اختیارات کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا امیر مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے یا نہیں؟ علمائے برصغیر میں سے صرف حافظ عبداللہ روپڑی نے اس مسئلہ سے تعرض کیا ہے اور وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ۔ ان کے رائے میں امیر مملکت'' اگر بے انصافی کرے تو جواب دہ ہوتا ہے'' (۴۸)۔

۱۲۔ ووٹ اور ووٹر (حقِ رائے دہی اور رائے دہندگان):

امیرِ مملکت / سربراہِ حکومت کے انتخاب کے علاوہ دیگر انتخابی عہدوں (مجالس قانون ساز، کونسل وغیرہ) کے لیے ووٹ کے صحیح استعمال کو علماء و مفتیان کرام نے بڑی اہمیت دی ہے۔ علماء نے ووٹ کو ایک امانت قرار دیا ہے اور اسے صرف اور صرف دیانت و امانت، عدل و قسط اور تقویٰ جیسی صفات سے متصف اور اچھے سیرت و کردار کے حامل امیدواروں کے حق میں استعمال کرنے نیز اس سلسلہ میں کسی بھی ترغیب و ترہیب، لالچ، طمع اور رشوت سے اجتناب کو شرعی فریضہ قرار دیا ہے۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں مفتی کفایت اللہ دہلوی (۴۹)، مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے تفصیل سے اظہار رائے کیا ہے۔ مفتی محمد شفیع کی رائے میں کسی امیدوارِ ممبری کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت و امانت بھی۔ اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں، اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کاذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر بلکہ اکبر کبائر میں شمار فرمایا ہے۔ جس حلقہ میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں فلاں آدمی قابلِ ترجیح ہے، تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا

اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔ ووٹ کی ایک شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے۔لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی، اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔اس لیے اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔اگر امیدوار بے دین و نا اہل اور ظالم ہے تو اس کو ووٹ دینا سخت گناہ ہے، کیونکہ ووٹ دینا ایک امانت ہے، امانت کو جو اس کا اہل ہو اس کے حوالے کیا جائے (۵۰)۔

ان فتاویٰ میں امیدواروں کی طرف سے ووٹوں کے حصول کے لیے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے، ووٹروں کو دنیوی لالچ دینے، اسی طرح کسی امیدوار کا رقم لے کر دوسرے امیدوار کے حق میں دست بردار ہونے کو صریحاً ناجائز اور حرام قرار دیا گیا ہے۔ووٹروں کا ووٹ کے معاوضہ میں اپنی ذات کے لیے روپیہ لینا رشوت اور ناجائز بتایا گیا ہے (۵۱)۔دیوبند مکتب فکر کے مفتیان کرام امیدواروں کے مسلک وعقیدہ کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک ''شیعہ کو ووٹ دینا سخت گناہ ہے۔ جس شخص کے مرزائی ہونے کے شواھد موجود ہوں اس کو ووٹ دینا قطعاً جائز نہیں۔ووٹروں پر لازم ہے کہ مرزائی کے بجائے کسی مسلمان کو منتخب کیا جائے'' (۵۲)۔

اس موضوع پر فتاویٰ کا خلاصہ یہ کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس کو محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ووٹر جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً وہ اس کے بارے میں اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم اور عمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، جس کام اور منصب کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں (۵۳)۔

۱۳۔عورت کا حق ووٹ (حقِ رائے دہی):

پاکستان وہند کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں اس موضوع پر بہت ہی کم فتاویٰ ملتے ہیں۔البتہ مفتی محمود نے، جو پاکستان کی انتخابی سیاست میں طویل عرصے تک سرگرم عمل رہے، اپنے ایک فتویٰ میں اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی رائے میں دینی وملی مصالح کا اگر تقاضا ہو تو عورت کو حقِ رائے دہی تفویض کیا جا سکتا اور وہ اپنے اس حق کو استعمال کر سکتی ہے۔''عورتوں کا ووٹ بنانا جائز ہے، ضروری نہیں۔اور اگر دینی مفاد کے پیشِ نظر ہو تو وہ اپنا ووٹ بے پردگی سے بچتے ہوئے استعمال کر سکتی ہے۔ اور اگر کوئی اہم دینی مصلحت پیشِ نظر نہ ہو تو عورتوں کے لیے ووٹ کا استعمال کرنا قباحت سے خالی نہیں'' (۵۴)۔

۱۴۔ووٹر کی اہلیت کے شرائط:

ووٹ کی اہمیت کے پیشِ نظر علماء نے ووٹر کی اہلیت کے شرائط بھی مقرر کیے ہیں۔ان کی رائے میں ووٹر کیے لیے ضروری ہے کہ وہ کھوٹے اور کھرے، نیک اور بد میں تمیز کا شعور رکھتا ہو تا کہ نیک اور صالح نیز اہل اور فرض شناس افراد قیادت کے منصب کے لیے منتخب ہوں۔اہل حدیث عالم مفتی عبدالستار الحماد کی رائے میں جس طرح ''سربراہ مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ کبائر سے گریزاں اور اس کا ماضی داغ دار نہ ہو، اسی طرح ووٹر کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب شعور اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو۔کسی کو نمائندہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے متعلق اس قدر لیاقت، معاملات کو سلجھانے اور اختلافات کو نمٹانے کی صلاحیت رکھنے کی گواہی دینا ہے۔اس لیے گواہی دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے برے کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور امیدوار کے کردار کو اچھی طرح جانتا ہو اگر ان باتوں کا خیال نہ رکھا گیا تو فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جب معاملات کی بھاگ ڈور نالائقوں کے سپرد کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا'' (۵۵)۔

۱۵۔اسلامی مملکت میں شہریوں کے حقوق:

ا) **مسلم شہریوں کے حقوق**: برعظیم پاکستان و ہند کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں شہریوں کے حقوق کے متعلق فتاویٰ کالمعدوم ہیں۔صرف مفتی محمد شفیع نے اپنے کتابچہ دستور قرآنی میں، جواب ان کے مجموعہ فتاویٰ جواھر الفقہ میں شامل ہے، شہریوں کے حق آزادی و حریت پر بھی مختصرا کلام کیا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے قیام پاکستان کے چند سال بعد ہی ۱۹۵۱ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے نفاذ اور حکومت کی طرف سے قومی سلامتی کے نام پر شہریوں کی پکڑ دھکڑ اور قید و بند کی سزاؤں کو غیر شرعی قرار دیا۔مفتی محمد شفیع نے اپنے ایک فتوے میں حکومت کی طرف سے شہریوں کی آزادی سلب کرنے کے بارے میں برملا طور پر کہا:

> ''حکومت کا فرض ہے کہ کسی باشندۂ ملک کی جائز آزادی کو سلب نہ کرے جب تک اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو اور اس کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے، اس لیے مروجہ سیفٹی ایکٹ اصول اسلام کیخلاف ہے۔ظاہر ہے کہ بلا اثبات جرم کسی شخص کو سزا دینا یا قید کرنا عدل و انصاف کیخلاف ہے اور قرآن مجید کی بیشمار آیات عدل و انصاف کی تاکید کے لیے نازل ہوئیں ہیں ...... محض پولیس کی رپورٹ پر کسی کو قید نہیں کیا جا سکتا اب تک اس پر باقاعدہ عدالت میں ثقہ اور قابل اعتماد شہادتوں سے جرم ثابت نہ کر دیا جائے۔اس کے یہ معنی نہیں کہ ملزم کو حراست میں نہ لیا جائے اور اس کو بھاگ جانے کا موقع دیا جائے بلکہ حاصل یہ ہے کہ حراست میں لینے کے بعد اس کے جرم کی تحقیقات کر کے کسی باقاعدہ عدالت کے سامنے اس کا جرم ثابت کرنے سے پہلے اس کو کسی معینہ مدت کے لیے قید نہیں کیا جا سکتا، تا تحقیقات حراست میں رکھنا اس کے منافی نہیں'' (۵۶)۔

ب) **غیر مسلموں کے حقوق**: زیر بحث فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ امر بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ علماء نے بلحاظ شہری حیثیت اور حقوق کے اسلامی مملکت کے مسلم اور غیر مسلم شہریوں میں فرق و امتیاز قائم رکھا ہے۔ ان فتاویٰ کی رو سے بہت سے معاملات میں غیر مسلموں کا درجہ مسلمان شہریوں کے مقابلے میں کم تر ہوگا، ان کو حکومت کی کلیدی اسامیوں پر تعینات نہیں کیا جائے گا، قضا اور افتاء کا کام ان کے سپرد نہیں کیا جائے گا (۵۷)۔

مفتیانِ کرام کی رائے میں اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کو ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ و سلامتی کا ویسا ہی حق حاصل ہوگا جیسا کہ مملکت کے مسلم شہریوں کو حاصل ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ غیر مسلم باشندگان ملک کی جان، مال، آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح مسلمان کی کی جاتی ہے (۵۸)۔ البتہ سیاسی اور مذہبی معاملات میں غیر مسلم شہریوں کو کھلے مقامات پر تبلیغی اجتماعات منعقد کرنے اور کفر و شرک کی تبلیغ کی اجازت حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح مملکت کے غیر مسلم شہریوں کو نہ صرف یہ کہ نئی عبادت گاہیں بھی تعمیر کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ وہ پرانی عبادت گاہیں کی مرمت تو کر سکتے ہیں البتہ قدیم عمارت پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ اس باب میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے یہ رائے ظاہر کی ہے:

> ''دارالاسلام میں غیر مسلموں کو تبلیغی اجتماع کی اجازت نہیں: دارالاسلام میں غیر مسلمین اپنے گھروں یا عبادت گاہوں میں مذہبی تبلیغ کر سکتے ہیں، کھلے مقامات پر انہیں تبلیغی اجتماع کی اجازت نہیں دی جا سکتی حتیٰ کہ وہ اپنی مذہبی کتاب بھی بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے...... غیر مسلمین کو دارالاسلام میں نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں، پرانی عبادت گاہیں باقی رکھ سکتے ہیں، ان کی مرمت بھی کر سکتے ہیں، مگر قدیم عمارت پر اضافہ نہیں کر سکتے، اسی طرح ان کا کوئی شہر فتح ہونے کے وقت اس میں اگر کوئی عبادت گاہ ویران تھی تو اسے ازسرِ نو آباد کرنے کی اجازت نہیں'' (۵۹)۔

مولانا ظفر احمد عثمانی کی اس رائے کو مکمل طور سے مفتی رشید احمد نے احسن الفتاویٰ میں اختیار کیا ہے (۶۰)۔ اہل حدیث مفتی محمد عبید اللہ خان عفیف کی رائے میں بھی اسلامی مملکت کی ''ذمی رعایا (ہندو، عیسائی اور قادیانی) نیا عبادت خانہ تعمیر نہیں کر سکتی'' (۶۱)۔

اختتامیہ:

اسلام کے دستوری قانون اور سیاسی نظام سے متعلق برعظیم پاکستان و ہند کے علماء کے مذکورہ فتاویٰ کے جائزہ سے یہ امر الم نشرح ہو جاتا ہے کہ ان (علماء و مفتیان کرام) کا سیاسی تفکر عمیق طور سے مسلم کلاسیکی قانونی و سیاسی فکر میں رچا بسا ہوا ہے۔ دستوری و سیاسی مسائل خصوصاً خلیفہ/امیر/رئیس مملکت کی اہلیت کے شرائط، اس کے انتخاب و تقرر کے طریق کار، مجلس شوریٰ کی تشکیل، اور اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور حقوق وغیرہ امور میں گزشتہ صدیوں میں علماء و فقہا نے جو

آراء پیش کی تھیں، ان فتاویٰ میں ان آراء کو کامل طور سے اختیار کرلیا گیا ہے (۶۲)۔ بالفاظ دیگر ان فتاویٰ میں تقلیدی رجحان کامل طور سے کارفرما ہے، اجتہادی آرا سے گریز کیا گیا ہے۔فنِ مملکت داری(statecraft) میں معاصر اقوام کے تجربات واختراعات کے بارے میں یہ فتاویٰ بالعموم خاموش ہیں۔ان فتاویٰ میں اسلامی دستور اور سیاسی نظام کے بعض اہم مسائل کے بارے میں بیان کی گئی آرا پاکستان میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کے داعی وعلمبرداروں (خصوصاً سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور علامہ محمد اسد، جنہوں نے اسلامی دستور اور سیاسی نظام کے خدوخال کی تنقیح کا قابل ذکر کام انجام دیا) کے آرا سے بھی مختلف نظر آتی ہیں (۶۳)۔علمائے اہل سنت کے مجموعہ ہائے فتاویٰ کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امیر مملکت کے انتخاب وتقرر کے معاملہ میں جمہور مسلمانوں کی رائے کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔وہ امور مملکت بالخصوص سربراہ مملکت وحکومت اور مجلس شوریٰ کے ارکان کے انتخاب میں جمہور مسلمین کی رضامندی اور رائے کے حصول کا کوئی قابل عمل میکینزم تجویز ہی نہیں کرتے۔

علماء حکومت کے مروجہ نظاموں میں سے صدارتی طرزِ حکومت کو اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر گردانتے ہیں، کیونکہ ان کی نظر میں حکم وفیصلہ کی ذمہ داری خلیفہ/امیر مملکت پر ڈالی گئی ہے جو صرف صدارتی طرزِ حکومت ہی میں ممکن ہوسکتی ہے، جب کہ پارلیمانی طرزِ حکومت میں امیر مملکت پر ایسی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔مزید براں وہ شوریٰ کو ایک غیر متعین ادارہ سمجھتے ہیں، وہ مجلس شوریٰ کے مدت انتخاب(tenure) کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

ان فتاویٰ میں سربراہ مملکت وحکومت کے لیے مجلس شوریٰ کے ارکان کے انتخاب وتقرر نیز فیصلہ سازی کے عمل میں شوریٰ کی اکثریتی رائے کے ردوقبول میں ویٹو کا اختیار تسلیم کیا گیا ہے۔یہ فتاویٰ رئیسِ مملکت کو مطلق العنان اختیارات سونپ دیتے ہیں۔دستوری وسیاسی مسائل پر ان فتاویٰ میں اسلامی مملکت کے مسلم اور غیر مسلم شہریوں کی حیثیت اور ان کے حقوق میں واضح فرق وامتیاز قائم کیا گیا ہے۔چنانچہ ان فتاویٰ کی رو سے اسلامی ریاست میں غیر مسلم قومیں جزیہ ادا کریں گی اور مذہبی حقوق نیز سیاسی وانتظامی معاملات میں ان کا درجہ مسلمان شہریوں سے کم تر ہوگا (۶۴)۔ان فتاویٰ کے جائزہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء جدید دور کی اسلامی مملکت کے دستور اور اس کے اداروں کی تشکیل وتنظیم(Statecraft) کے باب میں معاصر نظاموں کے تجربات سے اخذ واستفادے سے بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۲۷۳۔۱۳۴۰ھ/۱۸۵۶۔۱۹۲۱ء)، فتاویٰ رضویہ (لاہور: رضا فاؤنڈیشن، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء)، جلد۱۴: رسالہ دوام العیش من الائمۃ من القریش، (زندگی کا دوام اس امر میں ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے)، ص ۱۷۳-۲۴۷۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مسئلۂ خلافت(،لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۲ء)؛ مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی، ''خطبۂ صدارت''، اجلاس چہارم جمعیۃ العلماء ہند، بمقام ''گیا''، ۲۴ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء، زیر صدارت مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی، مشمولہ پروین روزینہ (مرتب)، جمیعت العلماء ہند: دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ تا ۱۹۴۵ء (اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۰ء)، جلد۱، ص ۱۵۴۔۱۷۴؛ سید سلیمان ندوی، ''خطبہ صدارت: اجلاس ہفتم جمعیۃ العلماء ہند، کلکتہ، ۱۱ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء''، مشمولہ پروین روزینہ (مرتب)، جمیعت العلماء ہند: دستاویزات، جلد۱، ص ۳۳۱-۳۳۸، ۳۴۲-۳۶۱۔

۳۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، فتاویٰ ثنائیہ (مرتبہ: مولانا محمد داود راز) ۲ جلدیں (لاہور: ادارۂ ترجمان السنہ، ۱۹۷۲ء)، جلد۲، ص ۵۹۸-۵۹۹۔

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: وحید عشرت، ''اقبال اور جمہوریت''، مشمولہ اقبال ۱۹۸۶ء (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۹۴-۲۹۵؛ جسٹس کریم اللہ درانی، ''اقبال کا اسلامی ریاست کا تصور''، اقبال ریویو (لاہور)، ۲:۲، ص ۷۔۱۸؛ وحید قریشی، اساسیاتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۶۔۱۸؛ وہی مصنف، ''علامہ اقبال کا تصور ریاست''، مخزن (لاہور)، ۲:۲ (۲۰۰۲ء)، ص ۷۷-۸۳؛ جاوید اقبال، زندہ رود (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۸۴-۴۸۵؛ وہی مصنف، ''اقبال اور عصر جدید میں اسلامی ریاست کا تصور''، مشمولہ سید محمد حسین جعفری (مرتب)، اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعۂ کراچی، ۱۹۸۸ء)، ص ۷۳۔۱۲۲۔ مزید دیکھیے: Allama Muhammad Iqbal, "Presidential Address - Allahabad Session", in Syed Abdul Latif (ed.) *Thoughts and Reflections of Iqbal* (Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1992), pp. 162-167, 173 190; Sir Muhammad Iqbal, *Islam as an Ethical and a Political Ideal* ed. S. Y. Hashimy (Lahore: Islamic Book Service, 1998), pp. 99-104, 106-108; Idem *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* ed. M. Saeed Sheikh (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1989), 122-25, 137-140, 142; Idem, "Political Thought in Islam", Abdul Vahid (ed.) *Thoguhts and Reflections* pp. 58-75; Javed Iqbal, "The Image of Turkey and Turkish Democracy in Iqbal's Thought and his Concept of Modern Islamic State", *Iqbal Review* 28:3 (1987), pp. 27-39.

۵۔ مجلس نظام اسلامی کی تشکیل اور اس کی کارگزاری کے بارے میں ملاحظہ ہو: عبدالماجد دریا بادی، ''پیش لفظ''، مشمولہ مولانا محمد اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۱-۳؛ سید سلیمان ندوی، ''شذرات''، معارف (اعظم گڑھ)، فروری ۱۹۴۱ء، ومئی ۱۹۴۱ء؛ دریا بادی (مرتب)، سید سلیمان ندوی کے خطوط، حصہ دوم، ص ۸۷-۸۹، ۱۰۱-۱۰۲؛ مسعود

عالم ندوی (مرتب)، مکاتیب سید سلیمان ندوی (لاہور: مکتبہ چراغ راہ،۱۹۵۴ء)، ص ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷۔

۶۔ دیکھیے: عبدالماجد دریابادی، ''پیش لفظ''، مشمولہ اسلام کا سیاسی نظام (مرتبہ: محمد اسحاق صدیقی سندیلوی)، ص ۱-۲۔

۷۔ Muhammad Asad, "Towards an Islamic Constitution", *Arafat*, 1:9 (July 1947), pp. 262-284۔ اس کی تلخیص ماہنامہ شمس الاسلام (بھیرہ، ضلع سرگودھا) میں شائع ہوئی۔ دیکھیے: محمد اسد مدیر عرفات، ''پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے کے بعد(۱)''، جون، جولائی ۱۹۴۷ء، ص ۵۷-۵۸۔؛ محمد اسد، ''پاکستان کا خواب شرمندہ ہونے کے بعد (۲)''، اگست ۱۹۴۷ء، ص ۳۴۔

۸۔ Asad, "Islamic Constitution-Making", *Arafat: Quarterly Journal of Islamic Reconstruction*, No. 1 (March 1948), pp. 16-62). ۔[اس تحریر کا اردو ترجمہ ماہنامہ شمس الاسلام (بھیرہ، ضلع سرگودھا) میں بھی شائع ہوا۔ دیکھیے: علامہ محمد اسد (جرمن نو مسلم سکالر)، ''اصول دستور اسلامی''، شمس الاسلام، مارچ ۱۹۴۹ء، ۲۷-۳۲۔

۹۔ ابوالاعلیٰ مودودی، دستوری تجاویز (لاہور: مرکزی مکتبۂ جماعت اسلامی پاکستان، ۱۹۵۲ء)؛ ماہنامہ ترجمان القرآن میں اسلامی دستور کے موضوع پر مولانا مودودی کی تحریروں کے لیے ملاحظہ ہو: حکیم نعیم الدین زبیری (مرتب)، اشاریہ ماہنامہ ترجمان القرآن، ۱۹۳۲-۱۹۷۶ء (کراچی: ادارۂ معارف اسلامی، ۱۹۸۵ء)، ص ۴-۱۱؛ سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)؛ امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست (لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۲ء)۔ علامہ محمد اسد اور سید مودودی کی تعبیرات و توجیہات علماء پر اثر انداز ہوئیں؛ مناظر احسن گیلانی، ''پاکستان کا اسلامی دستور''، صدق (لکھنؤ)، ۱۹۴۸ء)۔

۱۰۔ دیکھیے: نفاذِ اسلام کے لیے پاکستان کے علماء کرام کے بائیس نکات (اسلام آباد، دارالعلم، س۔ن)۔

۱۱۔ جب ۱۹۴۹ء میں یہ دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ دستور سازی کا کام شروع کیا تو حکومت پاکستان نے ایک اسلامی مشاورتی بورڈ بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کر کے پیش کرے گا اور اس کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے گی۔ اس بورڈ کے سربراہ جناب علامہ سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے اور مفتی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ (سابق استاذ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن)، پروفیسر عبدالخالق اور مولانا محمد جعفر حسین مجتہد ممبر کی حیثیت سے نامزد کئے گئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری بورڈ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہ بورڈ اگست ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک قائم رہا اور مفتی محمد شفیع شروع سے آخر تک اس کے اہم رکن رہے۔ اس بورڈ نے دستور پاکستان کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں اگرچہ ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان میں ان کی جھلک بڑی حد تک موجود تھی جس کے باعث وہ دستور ''اسلامی دستور'' کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ لیکن اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دستور میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گئیں اور نہ انہیں شائع کیا گیا۔ (مفتی محمد رفیع عثمانی، ''مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کے مختصر حالات زندگی''، مشمولہ مولانا مفتی محمد شفیع، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: جلد دوم یعنی امداد المفتین کامل (کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۱ء)، جلد ۲، ص ۸۷۔ مزید دیکھیے: Keith Callard, *Pakistan: A Political Study* (London: George Allen & Unwin Ltd., 1958), pp. 85-103; Leonard Binder, *Religion and Politics in Pakistan* (Berkeley, CA: University of California Press, 1963),

chaps. 4-5, pp. 137-182 ;Manzooruddin Ahmad, *Pakistan: The Emerging Islamic State* (Karachi: The Allies Book Corporation, 1966), chap. 6, pp. 89-122.

۱۲۔ رفیع عثمانی، ''عورت کی سربراہی: اکابر علماء کا فیصلہ''، مشمولہ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۸۲)۔]

۱۳۔ انصاری کمیشن کی سفارشات کے لیے دیکھیے: مولانا ظفر احمد انصاری (مرتب)، نظام حکومت کے بارے میں انصاری کمیشن کی رپورٹ، ۲۴ شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ/۴ اگست ۱۹۸۳ء (اسلام آباد: گورنمنٹ آف پاکستان، ۱۹۸۳ء)۔

۱۴۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء بالخصوص مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے فتاویٰ اور فقہ پر اپنی کتب میں نصوص قرآن وسنت اور خلافت راشدہ کے سیاسی نظائر سے اخذ کر کے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کرنے کی سعی کی تھی (ملاحظہ ہو: مفتی محمد شفیع، دستور قرآنی، کراچی: مکتبہ دار العلوم، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء)۔ مفتی محمد شفیع کا یہ خاکہ ان کے مجموعہ ہائے فتاویٰ جواہر الفقہ میں بھی شامل ہے دیکھیے: مولانا مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ: فقہی رسائل و مقالات کا نادر مجموعہ (کراچی: مکتبہ دار العلوم، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء)، جلد ۵، ص ۴۶۱۔ ۵۲۷۔ مزید براں انہوں نے ووٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق ایک مفصل فتویٰ بھی جاری کیا جس میں ووٹ کو ایک امانت قرار دیتے ہوئے اس کے جائز اور ناجائز استعمال کی صورتوں کی وضاحت کی۔ یہ فتویٰ بھی ان کی فقہی تالیف جواہر الفقہ میں شامل ہے۔

۱۵۔ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، طبع ششم، ۱۴۲۲ء)، جلد ۶، ص ۲۳۔

۱۶۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۲۱۔

۱۷۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۲۴۔ ۲۷۔

۱۸۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۲۶۔ ۲۷۔

۱۹۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۳۔

۲۰۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۴۔

۲۱۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۔

۲۲۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی، آپ کے مسائل اور ان کا حل، (کراچی: مکتبہ لدھیانوی، ۱۹۹۹ء) جلد ۸، ص ۱۸۲۔ ۱۸۵۔

۲۳/ا۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، جلد ۵، ص ۴۷۹۔

۲۳/ب۔ احسن الفتاویٰ، ص ۱۴۳-۱۴۴۔

۲۴۔ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، ص ۱۴۳۔

۲۵۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۴-۱۴۵۔

۲۶۔ دیکھیے: مولانا مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود (لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، جلد ۱۱، ص ۳۷۴-۳۷۵؛ مفتی محمد رفیع عثمانی و مولانا سلیم اللہ، ''عورت کی حکمرانی: اکابر علماء کا فیصلہ''، مشمولہ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۸۲۔ اس مفصل فتویٰ کے متن کے لیے دیکھیے: احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۴۹۔ ۱۸۲؛ ''عورت کی ولایت بالا جماع جائز نہیں''، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۸۳-۱۹۲۔

۲۷۔ مفتی محمد اشرف القادری، امارۃ المرأۃ: عورت کی حکمرانی کے مسئلہ پر محققانہ شرعی فتویٰ (نیک آباد، گجرات: اہلسنت اکیڈمی، جون ۱۹۸۸ء)، ص ۳-۵۔ عورت کی حکمرانی کے بارے میں جدید الخیال اہل قلم کے نقطۂ نظر کے بارے میں ملاحظہ ہو: مشیر الحق، ''عورت کی حکمرانی: ایک اسلامی نقطۂ نظر'' صحیفہ (لاہور)، شمارہ اپریل، جون ۱۹۸۹ء، ص ۱-۱۲۔

۲۸۔ مفتی محمد عبید اللہ خان عفیف، فتاویٰ محمدیہ: منہج سلف صالحین کے مطابق (مرتبہ: ابوالحسن مبشر احمد ربانی) (لاہور: مکتبۂ قدوسیہ، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۱۴-۴۱۷۔ مزید دیکھیے: حافظ صلاح الدین یوسف، عورت کی سربراہی کا مسئلہ اور شبہات و مغالطات کا ایک جائزہ (لاہور: دارالدعوۃ السلفیہ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء)؛ علامہ محمد اشرف سیالوی، اسلام اور عورت کی حکمرانی (لاہور: عالمی دعوتِ اسلامیہ، ۱۹۹۶ء)۔

۲۹۔ مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد ۱۱، ص ۴۷۵۔

۳۰۔ حافظ عبداللہ روپڑی، فتاویٰ اہل حدیث (تحقیق و تدوین: محمد صدیق بن عبدالعزیز) (سرگودھا، ادارۂ احیاء السنۃ النبویۃ، س۔ن)، جلد ۳، ص ۴۰۲-۴۰۳۔ حافظ عبداللہ روپڑی نے اپنی ایک دوسری کتاب مرزائیت اور اسلام میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

۳۱۔ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۴۴۔

۳۲۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۵۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۴۵-۱۴۶۔

۳۴۔ ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۵-۱۴۷۔

۳۵۔ انتخاب امام کے طریق کار کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے آراء کے بارے میں ملاحظہ ہو: ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (مترجمہ: مولانا عبدالشکور فاروقی و مولانا اشتیاق احمد) (کراچی: قدیمی کتب خانہ، س۔ن۔)، جلد ۱، ص ۱۷-۲۶، ۳۳-۳۵، ۵۳۱-۵۳۶۔ خلیفہ کے انتخاب وتقرر کے طریق کار خصوصاً امارۃ الاستیلاء کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے خیالات و آراء کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: عبیداللہ فہد، ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار''، مشمولہ محمد یٰسین مظہر صدیقی (مرتب)، حجۃ اللہ البالغۃ: ایک تجزیاتی مطالعہ (علی گڑھ: شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۱۹-۲۲۸۔

۳۶۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی، ''افتتاحیہ''، فتاویٰ ثنائیہ، جلد ۲، ص ۵۸۵۔

۳۷۔ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد، فتاویٰ اصحاب الحدیث، جلد دوم، ص ۴۵۸-۴۵۹۔

۳۸۔ حافظ عبدالمنان نور پوری، قرآن وحدیث کی روشنی میں احکام ومسائل، جلد ۲، ص ۶۹۲-۶۹۳۔

۳۹۔ محمد یوسف لدھیانوی، آپ کے مسائل اور اُن کا حل جلد ۸، ص ۲۰۲۔

۴۰۔ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، ص ۱۴۳۔

۴۱۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، جلد پنجم، ص ۴۶۷۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کے خلیفہ مفتی سید نعیم الدین مرادآبادی دونوں کی رائے میں شوریٰ کے تقرر وانتخاب کا اختیار امیر مملکت کو حاصل ہے۔ مؤخر الذکر کی رائے میں جماعت شوریٰ امیر کے ماتحت ہوگی۔ دیکھیے: محمد ادریس کاندھلوی، دستورِ اسلام مع نظام اسلام (لاہور: مکتبۂ عثمانیہ، س۔ن/ لاہور: تعلیمی پریس،

۱۹۶۸ء)، ص۵۳۔۵۸؛ سید غلام معین الدین نعیمی، حیات صدر الافاضل: حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کے حالات زندگی (لاہور: فرید بک سٹال، ۲۰۰۰ء)، ص۱۹۴-۱۹۵۔

۴۲۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، کتاب الحظر والاباحۃ، جلد پنجم، ص۴۶۱۔

۴۳۔ ایضاً، جلد۵، ص۴۶۱۔

۴۴۔ ایضاً، جلد۵، ص۴۶۸۔۴۶۹۔

۴۵۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی، آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد۸، ص۲۰۲۔ متعدد علمائے دیوبند نے شوریٰ کے ردو قبول کے بارے میں امیر مملکت کے اختیارات کے متعلق اسی نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ دیکھیے: مولانا محمد تقی عثمانی، حکیم الامت کے سیاسی افکار (کراچی: مکتبۂ دار العلوم، ۱۴۱۳ھ)، ص۳۱-۳۶؛ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی و مولانا مفتی محمد شفیع، اسلام میں مشورہ کی اہمیت (لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۷۶ء)، ص۱۵۲-۱۵۳؛ مولانا محمد مسیح اللہ خان شروانی، اہتمام و شوریٰ (کراچی: زمزم پبلشرز، ۲۰۰۳ء)، ۲۶، ۴۷-۴۸؛ مصنف رمرتب (نامعلوم)، شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں: علمائے دیوبند کی واضح تصریحات (جلال آباد، ضلع مظفرنگر: شعبۂ نشرو اشاعت، مدرسۂ مفتاح العلوم، س۔ن)۔

۴۶۔ عبداللہ روپڑی، فتاویٰ اہل حدیث، جلد۳، ص۴۰۲۔

۴۷۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی، ''افتتاحیہ''، مشمولہ فتاویٰ ثنائیہ، کتاب الامارۃ، ص۵۸۹۔ مولانا ریاست علی بجنوری نے بھی علماء کی اکثریتی رائے سے مختلف موقف ظاہر کیا ہے۔ ان کی رائے میں شوریٰ کی اکثریتی رائے سربراہ مملکت کے لیے واجب التعمیل ہے۔ وہ مجلس شوریٰ کی حاکمہ رتنفیذیہ پر بالادستی کے نظریے کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مولانا ریاست علی بجنوری، شوریٰ کی شرعی حیثیت (لاہور: مکتبہ کا لاہور، ۱۹۹۶ء)۔

۴۸۔ حافظ عبداللہ روپڑی، فتاویٰ اہل حدیث، جلد۳، ص۴۰۲۔

۴۹۔ دیکھیے مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، کفایت المفتی (جامع مؤلف: حفیظ الرحمٰن واصف) (دہلی: مطبع نعمانی، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء)، جلد۹: کتاب السیاسیات، فصل ہفتم، ص۲۹۴۔۳۸۱۔

۵۰۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، جلد۵، ص۵۳۲-۵۳۴؛ مولانا مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد۱۱، ص۳۶۷-۳۶۸، ۳۸۰۔

۵۱۔ مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد۱۱، ص۳۸۰۔

۵۲۔ ایضاً، جلد۱۱، ص۳۶۶-۳۶۷، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۵-۳۷۷، ۳۸۰۔

۵۳۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، جلد۵، ص۵۳۵۔

۵۴۔ مولانا مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد۱۱، ص۳۶۹۔

۵۵۔ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد، فتاویٰ اصحاب الحدیث (لاہور: مکتبہ اسلامیہ، ۲۰۰۲ء)، ص۴۵۸-۴۵۹۔

۵۶۔ مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، جلد۵، ص۴۸۶-۴۸۸۔

۵۷۔ مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد۱۱، ص۳۱۳۔

۵۸۔ مفتی محمد شفیع، جواھر الفقہ ، جلد۵،ص۴۹۰۔

۵۹۔ مولانا ظفر احمد العثمانی، اعلاء السنن (کراچی: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۱۴۱۵ھ)، جلد۱۲،ص۵۱۵-۵۱۷۔

۶۰۔ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد۶،ص ۱۸-۱۹۔

۶۱۔ مفتی محمد عبیداللہ خان عفیف، فتاویٰ محمدیہ،ص۸۶۶-۸۶۸۔

۶۲۔ مسلم کلاسیکی سیاسی افکار کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۹ء)؛ص ۱-۱۵۰۔ مزید دیکھیے: E. I. J. Rosenthal,*Political Thought in Medieval Islam* (Cambridge: Cambridge University Press, 1958; Antony Black, *The History of Islamic Political Thought: From the Prophet (PBUH) to the Present*(Karachi: Oxford University Press, 2001).

۶۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست (مرتبہ: خورشید احمد) (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)؛ مولانا امین اصلاحی، اسلامی ریاست (لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۲ء)۔ مزید دیکھیے: Muhammad Asad *The Principles of State and Government in Islam* (Berkeley, CA: University of California Press, 1961).

۶۴۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں لبرل اور آزادی روی پر مبنی نقطۂ نظر کے بارے میں ملاحظہ ہو: Fahmi Huweidi, "Non-Musliims in Muslim Society", in Abdelwahab(ed.), *Rethinking Islam and Modernity: Essays in Honour of Fathi Osman* (Leicester: The Islamic Foundation, 2001/1422 A. H.), pp. 84-91.